مختصر افسانہ

مختصر افسانہ جدید دور کی اہم نثری صنف ہے۔ اِس کے ذریعے کسی شخص کی زندگی کے ایک اہم پہلو یا کسی واقعہ کا بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اُس کا اثر گہرا پڑے۔

افسانے کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک نقّاد کا کہنا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔ ایک اور نقّاد کا کہنا ہے کہ افسانہ ان کہانیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتّفاق سے کہانی ہونے کے علاوہ مختصر بھی ہوتی ہیں۔ یہ کہانی کی ایک واضح فنّی صورت ہے۔ ایجاز و اختصار، جدّت، فنّی حُسن اور تخیّل کی چاشنی اِس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ افسانہ سیدھی سادی کہانی نہیں بلکہ ایسی فنّی تخلیق ہے جس میں فن کار کے ارادے اور حکمت کو دخل ہوتا ہے۔ کسی مخصوص واقعے یا صورت حال یا کسی مخصوص کردار کا نقش اس طرح ابھارا جاتا ہے کہ پلاٹ یعنی واقعات کی ترتیب و تنظیم پڑھنے والے کو متاثر کر سکے۔

افسانے کے ماہروں نے اس کی جو تعریفیں بیان کی ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ افسانہ بیانیہ تخلیقی تحریر ہے۔ افسانے میں کسی ایک کردار یا کرداروں کے ایک مخصوص گروہ کے نقوش یا ذہنی کشمکش کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ افسانے میں واقعات کی تفصیل، کرداروں کی گفتگو اور منظر و ماحول کی پیشکش بہت نپی تلی ہوتی ہے۔

ہر افسانے کے لیے پلاٹ، کردار اور زمان و مکان لازمی اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لحاظ سے افسانے کی اقسام بھی بیان کی گئی ہیں یعنی پلاٹ کا افسانہ، کردار کا افسانہ یا پس منظر کا افسانہ۔

© NCERT not to be republished

افسانے کی کامیابی کے لیے کچھ ناقدین، افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کو بھی اہم قرار دیتے ہیں۔ افسانہ نگار کے اسلوب میں رمز، کنایے اور تاثیر کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

اردو میں مختصر افسانے کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ہوا۔ ہندوستان میں کتھا کہانی کا رواج تو صدیوں پرانا ہے، اسی طرح عربی اور فارسی میں داستان اور قصص کی روایت ملتی ہے لیکن مختصر افسانے کی صنف اردو میں مغرب کے اثرات کی دین ہے۔ اردو میں سب سے پہلے پریم چند اور یلدرم نے افسانے لکھے۔ ان کے فوراً بعد کئی افسانہ نگار مختلف طرزوں میں نمایاں ہوئے مثلاً ل۔ احمد اکبر آبادی، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی وغیرہ نے اردو افسانے کو نئی جہت عطا کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے افسانہ اردو فکشن کی مقبول ترین صنف بن گئی۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس سے چند برس پہلے ''انگارے'' کے نام سے باغیانہ کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔ ان کہانیوں نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے نئے تجربوں کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بہت پہلے پریم چند (1880 تا 1936) نے اردو افسانہ نگاری کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ پریم چند نے حقیقت نگاری اور نفسیاتی کردار نگاری کے ساتھ مشرقی یوپی کے دیہاتوں کی زندگی اور قومی زندگی میں نمایاں ہونے والے سیاسی اور حُرّیتی جذبات کو بھی نمایاں کیا۔ چند ہی برسوں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عبّاس، احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ کے ہاتھوں اردو افسانے نے بہت ترقی کی۔ زندگی کے گوناگوں مسائل اور موضوعات پر لکھا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، سماجی اصلاح اور قومی شعور کے اظہار کا چلن بھی عام ہوا۔

آزادی کے بعد اُبھرنے والے افسانہ نگاروں میں قرّۃ العین حیدر نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ 1960 کے لگ بھگ اردو میں علامتی افسانے کا آغاز ہوا۔ اس رنگ کے نمائندہ افسانہ نگار: انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجّاد، بلراج مین را اور خالدہ حسین ہیں۔ حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی،

© NCERT not to be republished

شوکت صدیقی، اشفاق احمد، رام لال اور جوگندر پال قابلِ ذکر ہیں۔ نئی نسل کے کئی افسانہ نگاروں نے براہ راست طرزِ بیان کے بجائے علامتی طرزِ بیان کو ترجیح دی۔ لیکن علامتی اور تجریدی افسانوں کی مقبولیت اب پہلی جیسی نہیں رہی۔

© NCERT not to be republished

سیّد رفیق حسین

(1946 —1894)

سیّد رفیق حسین لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر مقیم رہے۔ شکار کے شوق کے ساتھ ساتھ انھیں حیوانوں کی فطرت کے مطالعے کا ذوق بھی تھا۔ انھوں نے جانوروں کی نفسیات پر متعدد افسانے لکھے۔ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف اور منفرد ہیں۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''آئینہ حیرت'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہی مجموعہ ''شیر کیا سوچتا ہوگا'' کے نام سے بھی طبع ہوا۔ ان کی زیادہ تر تحریریں، جانوروں کی فطرت اور عمل کی عکاسی کرتی ہیں۔

رفیق حسین کے افسانوں میں مناظرِ فطرت کی ایسی حسین اور سچّی تصویریں ملتی ہیں جن کی نظیر اردو میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ الفاظ کے صوتی آہنگ سے تاثر پیدا کرنے میں رفیق حسین کو کمال حاصل ہے۔ مختلف جانوروں کی آوازیں، پرندوں کی بولیاں، پانی کے بہنے کا شور، ہوا کے چلنے کی دھیمی اور تیز آوازیں، جنگل کی سائیں سائیں سب کچھ اُن کے افسانوں میں موجود ہے۔ موزوں الفاظ کے توسط سے رفیق حسین اپنے قاری کو جنگل کی دُنیا میں لے جا کر تمام آوازیں سُناتے ہیں۔

افسانہ ''گوری ہو گوری'' کا بنیادی کردار گوری نام کی ایک گائے ہے جو وفاداری اور ایثار کا پیکر ہے۔ رفیق حسین نے سیلاب کے پس منظر میں گوری کا کردار اس طرح اُبھارا ہے کہ وہ محبت اور مامتا کی علامت بن کر دل پر اثر کرتی ہے۔

گوری ہو گوری

5160CH06

چوماسے کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے: ٹر، ٹر، ٹر۔ پیپل کے سوکھے ڈگالے پر الّو کہتا تھا: ہک ہؤ ہک ہؤ۔

بسنتی نے کروٹ لی، پھر منھ پر تھپّڑ مارا۔ بولی: ''ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈانس لاگیں۔''

چھ مہینے کا بچّہ پاس لیٹا تھا، اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی: ''مری جائے، پھر آئے بیٹھا، بولت کیسے ناس پیٹا۔''

''ہک ہؤ، ہک ہؤ''

''اجی، او جی اٹھونا۔ گھگو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اُڑائے دے۔''

مادھو آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا، جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر پھر نیچے دیکھا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چھوٹا سا کچّا گھر تھا۔ چھوٹی چمنی کے دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھل جھلا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔

مادھو بولا: ''جو کا ہُوا رے۔''

بسنتی گھبرا کر اُٹھی۔ بولی: ''اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام بھیکا کو جگا لو۔ ارے رم کلیا کو جگا لو۔ پانی آئے گیا رے۔ ارے او بھیکا۔ رام کلیا ہو۔ اری او رم کلیا۔''

آٹھ برس کی دُبلی پتلی رم کلیا جاگی۔ چھ برس کا بھیکا جاگا، دودھ پیتا پاس لیٹا بچّہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلّائے۔

''چُپ کرو چُپ۔'' مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان

دیا۔ دور کہیں سے آواز آرہی تھی: گڑپ شل شل شل۔ گڑپ شل شل شل۔

گھگو بولا: ''ہک ہؤ!''

کھٹولے سے کود، پانی میں چھپ چھپاتے بچّے ماں سے چمٹے۔ مادھو اُٹھا۔ دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی۔ ''اجی جاوت کہاں ہو جی۔''

باہر سے آواز آئی ''مادھو بھیّا ہو۔ او مادھو۔ ارے باڑھ آئی۔ اُٹھ رے اُٹھ۔''

''شڑپ گڑپ، شل شل شل۔'' پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

''مم ... مم... میں۔'' بکری بولی۔ ہاں ہاں آں۔ کہیں گئیاں چلاّ رہی تھیں۔ بارہ گھر کے گوجر پروے میں ہل چل مچ گئی۔ سب جاگ اُٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکارتا تھا۔ کوئی چلاّ تا تھا۔ کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رم کلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اُٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے تیرتی ہنڈیا پکڑ لی۔ مٹکا کترایا ہُوا پرے سے نکلا جاتا تھا۔ اسے پیر سے روکا۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلاّ رہے تھے۔ گھر کے اندر رم کلیا اور بھیکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہُوا: ''بھاگو۔ او بسنتی نکل۔ ارے مادھو بھاگ۔''

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اُچکا۔ رانوں تک آیا۔

''بھاگو، بھاگو۔ مادھو بھیّا بھاگو رے۔ ارے کا ہوئے گیا۔ نِکلت کا ہے ناہیں۔''

باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی نے پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔

بسنتی روئی۔ ''ارے مورے کڑوے، اری موری ہنسلی تو نکال لے رے۔''

''چل چل تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے نون چون تو لیے لوں۔ اوڑھنا بچھورا تو دبائے لوں۔''

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلانا تھا۔ دروازے پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا۔ آدمی گھر میں آ گئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ ''چالو چالو سب چھوڑو، جان ہی بچائے لو، چالو چالو۔''

اس گڑبڑ میں، جلدی میں، گھبراہٹ میں، اندھیرے میں، دری، بچھورے کپڑوں کے لیے پکارتی، برتنوں اور زیوروں کے لیے پھڑکتی، بسنتی نے یہ بھی کہا: ''بھیارے رم کلیا کو لے رے۔'' لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا: ''موں اُٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہرے۔''

پانی کی شل شل، رات اندھیری، بادل کی گرج۔ کمر کمر، سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی، پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چِلّا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا، سنبھالتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا، دوسرا اُبھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پُروے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے آ کر پون میل کے فاصلے پر ریل کی پٹری کا رُخ کیا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر کمر اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ اِدھر اُدھر۔ دوُر اور نزدیک آوازیں ان کی آ رہی تھیں:

''جانکی ہو جانکی!''

''آئے رہوں دادا!''

''مُرلی ہو مُرلی!''

''بھلا رے بھلا۔ چالے چالو!''

ڈکراتی بھینسیں، چلاتی گائیں، ممیاتی بکریاں، روتے بچّے، سہمی عورتیں، پکارتے مرد، سب بھیگے، سب پانی ٹپ ٹپاتے ریل کی پٹری پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سوُنی پٹری آباد ہوگئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آ گیا ہے اور کون کون رہ

گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی کی گئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک ...کا لڑکا اور بچّوں میں رم کلیا کم تھی۔

بسنتی نے رم کلیا کے واسطے بِلک بِلک کر رونا شروع کر دیا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ وہیں پر اُن کی گوری گائے کھڑی ارّاتی تھی: ''تو کاں آں ھ۔ تو کاں آں ھ۔'' یہ بھی دُکھ پیٹی ماں ہے۔ ارے کوئی جانے یا نہ جانے بچھڑا اِس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دُکھیا روتی ہے: ''تو کاں آں ھ۔''

روتی ہچکیاں لیتی بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور روئی:

''گوری رے موری رم کلیا......ایھ ایھ ایھ ایھ''

''گوری رے اب تو ہے کون چَرائے ...... ایھ ایھ ایھ ایھ''

''گوری توری رم کلیا تو گئی رے ...... ایھ ایھ ایھ ایھ''

''گوری توری رم کلیا...... ابھ ابھ ابھ ابھ۔''

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی ......'' تو کاں آں ھ''

کوئی جانے نہ جانے۔ دل کی لگی رام جانے۔ گائے نے چلاّ چلاّ کر اور بسنتی نے سسکیاں لے کر آخر صبح کر ہی دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پروے کی طرف اُٹھ گئیں: سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اسی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پروا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ اگر کوئی بچا کھُچا مکان ہوگا تو درختوں کی آڑ میں ہوگا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے مل رہے تھے اور پھر ان کے پار میلوں میلوں جہاں جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔

جب تک اندھیرا رہا ہڑپ، گڑپ گڑاپ کرتے پانی نے رم کلیا کو خوب ہی ڈرایا اور روتے روتے بے دم، گز بھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا

دیا۔ ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے، تو نہ مکان ہیں نہ گاؤں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے۔ دوسرے کونے پر کالا سانپ کنڈلی مارے، بل کھایا بیٹھا دُہری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔

رم کلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موندلی تھیں اور ''اری میّاری ... او میری میّا۔'' کہہ کر بلک رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی: ''تو کاں آں ھ۔'' رم کلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مُردہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

''تو کاں آں ھ۔'' آواز پھر آئی۔

رم کلیا نے ''ہرے رام گوری بولے۔'' کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رم کلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا ''گوری، ہو گوری!''

جواب آیا: ''تو کاں آں ھ''

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رم کلیا نے پھر پکارا۔ وہ اسی کی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔ لیکن دُور سے ایک اور آواز آئی: ''اوماں آں ھ۔''

باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اُس آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رم کلیا کا ننّھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی سکت بھر چلاّئی:

''گوری، ہو گوری!''

''گوری، ہو گوری!''

''ارے گوری رے، آئے جا!''

''گوری میّا، آئے جاری!''

لیکن گوری نے رُخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رم کلیا کی طرف دیکھا۔ اڑّا کر بولی اور پھر اُدھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے بچھڑے کی آواز آرہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا، اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آیا، جہاں سرِ شام وہ، اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی۔ لیکن اب

سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بچے کی آواز کا جواب دیتی، تیرتی تیرتی اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی۔ اسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی گئی مگر بچّہ نہ چلا۔ وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی۔ برابر آ کر اپنی کمر اور پیٹ سے اسے ڈھکیلا۔ ایک طرف چلی، بچّہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی۔ بچّہ چھ فٹ زمین میں گڑے ہوئے گھونٹے میں رسّی سے بندھا ہوا تھا۔ اور رسّی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی۔ لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسّی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر، چِلاّتے بچّے کو وہیں چھوڑا اور پھر رم کلیا کی طرف رُخ کیا۔

رم کلیا، رونے چلانے کی تھکن، ڈر، خوف اور آخر میں انتہائی نا اُمیدی کا اب تک مقابلہ کرتی رہی تھی۔ لیکن آخر آٹھ برس کی ننّھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آ کر کئی آوازیں دیں اور جب بھی رم کلیا کو ہوش نہ آیا تو کھردری گرم گرم زبان سے اس کا منھ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آ گیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا۔ ''گوری میّا۔ گوری میّا'' کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے، آگے بڑھی۔ رم کلیا چھت سے گھسٹ کر پانی میں آ گئی۔ اس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور چمٹ چمٹا کر گوری کی پیٹھ پر آ گئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چِمٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس آئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اس کے گرد چکّر لگائے اور چلی۔ جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو لوٹ آئی۔ اب رم کلیا کی بھی سمجھ میں آ گیا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی، رم کلیا نے اوندھے منھ لیٹے لیٹے، ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسّی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہو گیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رم کلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹری کی طرف سے دھار چل رہی تھی۔ اس لیے یہ دونوں بہاؤ ہی کی طرف تیرتے چل دیے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکّر کھا کر پھر، اسی ریل کی پٹری پر چڑھ آئے۔

دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، پیٹھ پر رم کلیا، پیچھے بچھڑا ''او ماں آں ھ'' کے سوال جواب کرتے گاؤں والوں میں پہنچے تو ہل چل مچ گئی۔لوگ مارے خوشی کے کوٗدتے تھے۔بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی، کبھی رم کلیا کو گلے لگاتی تھی، کبھی بچھڑے کو اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی اور گائے کہتی تھی:

''تم ماں آں ھ۔ہم ماں آں ھ'' — آواز آئی۔

''بول گوری میا کی جے''
''بول گئوماتا کی جے۔''

مشق

لفظ و معنی

چوماسا	:	برسات کے چار مہینے
ڈگالا	:	درخت کی موٹی ٹہنی
ڈانس	:	بڑا مچھّر
مری جائے پھر آبیٹھا	:	مرجائے پھر آبیٹھا
گھگھو	:	بڑا اُلّو
تنی اُڑائے دے	:	ذرا اُڑا دے
جوکا ہوا رے	:	یہ کیا ہوا
اجی دیکھت کا ہو	:	اجی دیکھتے کیا ہو
کھٹولا	:	چھوٹی چارپائی
گئیاں	:	گائیں

© NCERT not to be republished

ارے کائے ہو گیا		
نکلت کاہے ناہیں	:	ارے کیا ہو گیا نکلتے کیوں نہیں
کڑوے	:	کڑا کی جمع کڑے اودھی اور پوری طرز میں زورِ بیان کی خاطر الفاظ یا اسما کے بعد الف یا و الف یا ے سے الف لگاتے ہیں۔ لہٰذا کڑا سے کڑوا اور کڑوا سے کڑوے۔
نون چون	:	نمک آٹا
اوڑھنا بچھورا	:	اوڑھنا بچھونا
موں اٹھائے لوں	:	میں اُٹھا لیتا ہوں
نِکس باہرے	:	نکل باہر
آئے رہوں	:	آ رہی ہوں
بھلا رے بھلا	:	سب ٹھیک ہے
دُکھ پیٹی	:	دُکھیاری
دھاروں دھار رونا	:	پھوٹ پھوٹ کر رونا

غور کرنے کی بات

- رفیق حسین کی کہانیوں میں انسان، حیوان، قدرتی طاقتوں اور مناظر کے آپس میں متاثر ہونے کی سچّی عکاسی ملتی ہے۔ اُردو افسانہ نگاری میں یہی ان کی انفرادیت ہے۔
- اِس کہانی میں ممتا کے جذبے کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان تو کیا جانوروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ گوری جو ایک گائے ہے وہ اپنے مالکن کی ممتا کو سمجھتی ہے اور سیلاب میں پھنسے اپنے بچھڑے کو بچانے سے پہلے اُس کی لڑکی رم کلیا کی جان بچاتی ہے۔
- افسانہ نگار نے اودھی کے برمحل الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں۔

© NCERT not to be republished

سوالات

1. مادھواور بسنتی موسلا دھار بارش میں اپنا گھر چھوڑ کر کیوں بھاگ رہے تھے؟
2. بسنتی کی بات سُن کر گوری نے کیا کیا؟
3. گوری نے رم کلیا کو کس طرح بچایا؟
4. رم کلیا نے گوری کے بچھڑے کو بچانے کے لیے کیا کیا؟
5. مامتا کے جذبے کے آگے تمام جذبات ہیچ ہیں۔ وضاحت کیجیے
6. گوری کے کردار پر مختصراً لکھیے

عملی کام

- اگر آپ گوری کی جگہ ہوتے تو اس وقت کیا کرتے؟ اپنے لفظوں میں لکھیے
- ہم نے کڑا۔ کڑے۔ کڑوے کے بارے میں اوپر لکھا ہے۔ آپ اپنی طرز سے سوچ کر اس طرح کے لفظ لکھیں۔ مثلاً کتاب سے کتب وغیرہ

© NCERT not to be republished